نفسِ انسانی کے مختلف پہلو
اوراس کی متنوّع کیفیتیں
قرآن حکیم کی روشنی میں

ڈاکٹراسراراحمد

ایک تقریر جو پانچویں بین الاقوامی مسلم سائیکالوجی کانفرنس
منعقدہ جناح لائبریری ہال لاہور میں بتاریخ ۱۶/ فروری ۲۰۰۱ء کی گئی

خطبہ مسنونہ' چند قرآنی آیات کی تلاوت' اور ادعیہ ماثورہ کے بعد عرض کیا گیا :

جناب صدرِ مجلس محترم ملک معراج خالد صاحب' اصحابِ علم و فضل اور معزّز خواتین و حضرات!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

علماء و طلبہ نفسیات کی اس محفل میں میرا خطاب کچھ انمل بے جوڑ سی بات ہے' اس لئے کہ مَیں کبھی سائیکالوجی کا طالب علم نہیں رہا۔ تاہم جب مجھے اس کی محبت بھری اور نہایت الحاح و اصرار پر مبنی دعوت ملی' تو میں ایک تو اس بناء پر آمادہ ہو گیا کہ مَیں قرآن حکیم کا طالب علم بہرحال ہوں' اور قرآن جہاں عمرانیات کے دوسرے شعبوں کے بارے میں حکمت و احکام عطا فرماتا ہے وہاں آفاق و انفس اور ان کی وسعتوں اور گہرائیوں کی جانب بھی نہایت حکیمانہ اور بصیرت افروز اشارے کرتا ہے۔ بنا بریں میں نے سوچا کہ نفس انسانی کے مختلف پہلوؤں اور اس کی متنوع کیفیات کے ضمن میں جو روشنی مجھے اپنے

پچاس سالہ مطالعۂ قرآن سے حاصل ہوئی ہے اسے آپ حضرات کے ساتھ share کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے!

ویسے نفسیات کے علم سے مجھے ابتداء ہی سے دلچسپی بھی رہی ہے ـــــ چنانچہ اس کے باوجود کہ میں نے اپنی میڈیکل کی تعلیم کے سال دوم کے دوران ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ "میری زندگی میں ڈاکٹری کے فن یا پیشے کو صرف ثانوی حیثیت حاصل رہے گی' اولیت کا درجہ اللہ کے دین کو عملاً قائم کرنے کی جدوجہد اور اس کے لئے قرآن کے علوم و معارف کی تحصیل اور نشر و اشاعت کو حاصل رہے گا"۔ تاہم ایم بی بی ایس کی تعلیم کے آخری سال کے دوران اگر میڈیکل لائن میں اعلیٰ تعلیم یعنی Post Graduation کا کوئی خیال آیا تو وہ صرف .D.P.M (ڈپلومہ ان سائیکولوجیکل میڈیسن) ہی کا تھا ـــــ اگرچہ' اسی سبب سے جس کا ذکر پہلے ہو گیا ہے' اس کی نوبت نہیں آئی۔

مَیں نے فلسفہ اور منطق کی تعلیم بھی اگرچہ باضابطہ کبھی حاصل نہیں کی ـــــ تاہم کچھ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ذہن منطقی عطا فرمایا ہے' اور کچھ اس سبب سے کہ قرآن حکیم کے اصل اور اساسی موضوع یعنی ایمان کے ڈانڈے لامحالہ فلسفہ سے ملتے ہیں ـــــ مجھے اس علم سے بھی فطری شغف رہا ـــــ اور خصوصاً تحلیل نفسی اور نفس انسانی میں مختلف بلکہ متضاد رجحانات کے باعث پیدا ہونے والے conflicts کے تجزیئے سے بہت دلچسپی رہی ہے۔

چنانچہ زمانہ طالب علمی ہی کا ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ جب میں فائنل ایئر ایم بی بی ایس کا امتحان دے رہا تھا' میرے ایک دوست اور ہم مقصد ساتھی (یعنی اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن) اظہر حسن صدیقی سیکنڈ پروفیشنل کا امتحان دے رہے تھے ـــــ اس وقت میں نے ان کی جو کیفیت دیکھی اس کی بنا پر ان سے کہا کہ: "اظہر صاحب! آپ کبھی امتحان دیتے ہوئے ذہنی توازن کھو بیٹھیں گے!" تاہم میری اس بات کو سنجیدگی سے نہ لیا گیا ـــــ اور بات ہنسی میں ٹل گئی ـــــ لیکن میری یہ پیشین گوئی حیرت انگیز طور پر اگلے ہی سال درست ثابت ہو گئی ـــــ میں تو ایم بی بی ایس سے فارغ ہو کر منٹگمری (ساہیوال) منتقل ہو چکا تھا ـــــ اظہر صاحب تھرڈ پروفیشنل کے امتحان کے دوران ایک زبانی امتحان (VIVA-VOCE) میں دفعتاً پٹڑی سے اتر گئے اور ممتحن سے کہنے لگے:

"چھڈ یار! گلّاں بعد وچ ہون گیاں' پہلے سگریٹ پیا!" (واضح رہے کہ اظہر صاحب پنجابی نہیں بلکہ اردو سپیکنگ لوگوں میں سے تھے!) ـــــ بہرحال پہلے ان کا علاج کراچی میں کرایا گیا۔ اُس وقت تک غالباً پورے ملک میں کوئی ایک بھی باضابطہ سند یافتہ ذہنی معالج موجود نہ تھا۔ کراچی میں ڈاکٹر افضل حبیب صاحب ہوتے تھے' لیکن وہ بھی غالباً سند یافتہ ڈی ۔ پی ۔ ایم نہیں تھے ـــــ اور اس پر مستزاد یہ کہ بہت مہنگے معالج تھے ـــــ چنانچہ اظہر صاحب کے لواحقین انہیں اپنے وطن مالوف بریلی (بھارت) لے گئے جہاں سے ہجرت کر کے یہ خاندان پاکستان آیا تھا۔ اور وہ کئی ماہ وہاں مقیم رہ کر صحت یاب ہو کر واپس آئے اور اپنی ادھوری تعلیم کی تکمیل کے لئے لاہور آئے تو ایک روز اچانک ان سے سر راہے ملاقات ہو گئی جس پر وہ چھوٹتے ہی کہنے لگے: "دیکھئے! اب دوبارہ وہی بات نہ کہہ دیجئے!" جس پر میں نے عرض کیا کہ آپ میرے کہنے کے باعث بیمار نہیں ہوئے تھے بلکہ اپنی ترجیحات کو متعین نہ کرنے کے باعث اس حادثہ سے دوچار ہوئے تھے۔ (ڈاکٹر اظہر حسن صدیقی' جماعت اسلامی کے نامور رہنما اور نائب امیر جناب پروفیسر غفور احمد صاحب کے برادر نسبتی ہیں' اور آج کل ماشاء اللہ کراچی میں بہت کامیاب اور مقبول عام میڈیکل پریکٹیشنر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں)

اظہر صاحب کے بارے میں میری اس پیشین گوئی کی بنیاد ایک مخمصہ (dilemma) پر قائم تھی' جس سے خود مَیں بھی دوچار رہا تھا ـــــ اور وہ یہ کہ ایک جانب ہم اسلام کی دعوت و اقامت کی جِدّوجُہد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا چاہتے تھے ـــــ اور دوسری طرف یہ بھی چاہتے تھے کہ اپنی فنی تعلیم اور کیریئر کے ضمن میں بھی اپنے سابقہ اعلیٰ معیار کو قائم رکھیں ـــــ اور یہ ظاہر ہے کہ اَن ہونی اور ناممکن بات تھی۔ ادھر میں نے تو آغاز ہی میں (یعنی میڈیکل کالج کے دوسرے سال ہی کے دوران) اپنی وہ واضح ترجیح طے کر لی تھی جو پہلے بیان ہو چکی ہے ـــــ لیکن اظہر صاحب نے ایسا کوئی واضح فیصلہ نہیں کیا تھا ـــــ بنابریں دو متضاد سمتوں کی کشاکش نے ان کے ذہن کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار دیا۔

نظری علم النفس (Theoretical Psychology) کے علاوہ مجھے ایک ذہنی مریض کی بھی مسلسل تیرہ سال تک تیمار داری کا تجربہ ہے ـــــ میں ۱۹۵۲ء میں سیکنڈ پروفیشنل ایم بی بی ایس کا امتحان دے رہا تھا جب والد صاحب مرحوم کو ذہنی عارضہ کا پہلا

حملہ ہوا ـــــ اور ایم بی بی ایس سے فراغت کے بعد میں اسی لئے منٹگمری منتقل ہوا تھا کہ والد صاحب کی تیمار داری کر سکوں ـــــ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں ان کے انتقال تک مسلسل تیرہ برس تک مَیں ان کی Excitation اور Depression کی alternate cycles کا مشاہدہ کرتا رہا ـــــ اور اگرچہ میں .D.P.M تو نہ کر سکا لیکن اس فن کی ابجد سے کم از کم "Dispenser" ہونے کی حد تک واقف ضرور ہو گیا!

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ :

قرآن حکیم کی رو سے "آیات" یعنی نشانیوں کے الفاظ کا اطلاق بنیادی طور پر تین چیزوں پر ہوتا ہے ـــــ ایک آیاتِ قرآنی ـــــ دوسرے آیات آفاقی ـــــ اور تیسرے آیاتِ انفسی! ـــــ اور ایک مقام پر ان تینوں کو اس طور سے متعلق و مربوط قرار دیا گیا ہے کہ :

﴿ سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ ﴾

(حٰمٓ السجدۃ : ۵۳)

یعنی "ہم عنقریب لوگوں کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور ان کے اپنے نفوس میں بھی ـــــ یہاں تک کہ یہ بات اُن پر پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ یہ (یعنی آیاتِ قرآنیہ) سراسر حق ہیں!"۔

ترجمان القرآن علامہ اقبال نے ایک طرف آیاتِ آفاقی کی جانب اشارہ کیا ہے اپنے اس شعر میں کہ ؎

کھول آنکھ ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ ' فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

اور دوسری طرف آیاتِ انفسی کی جانب متوجہ کیا ہے' اپنے ان الفاظ کے ذریعے کہ ؏ :

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!

اور اپنی شہرۂ آفاق نظم "لینن خدا کے حضور میں" کے تو پہلے ہی شعر میں دونوں کو جمع کر دیا ہے۔یعنی ؎

اے انفس و آفاق میں پیدا تری آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات!

چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ حقائقِ کونیہ اور حقیقت الحقائق تک رسائی کے یہی دو راستے ہیں: یعنی ایک بنیادی طور پر "بیروں بین" لوگوں یعنی Extroverts کے لئے ــــــ جیسے کہ قرآن کہتا ہے:

﴿ اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ○ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ○ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ○ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ○ ﴾ (الغاشية : ۱۷-۲۰)

یعنی "کیا یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے (ماحول کے ساتھ صد فی صد مطابقت رکھنے والا) بنا دیا گیا ہے، اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بلند کر دیا گیا ہے ــــــ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے گاڑ دیئے گئے ہیں، اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے ہموار کر دی گئی ہے!" ــــــ

اور دوسرا "دروں بین" لوگوں یعنی Entroverts کیلئے ــــــ جیسے فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ○ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ○ ﴾ (الذّٰريٰت : ۲۰،۲۱)

یعنی "زمین میں بھی یقین کرنے والوں کے لئے (اللہ کی) نشانیاں ہیں۔ اور خود تمہارے اپنے نفوس میں بھی، تو کیا تم مشاہدہ نہیں کرتے؟"

اس دوسری راہ کے ضمن میں میرزا عبد القادر بیدلؒ کا ایک نہایت فصیح و بلیغ اور دلکش اور دل آویز شعر ہے کہ ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو و سمن درآ
تو زغنچہ کم نہ دمیدہ ای، درِ دل کشا بہ چمن درآ!

یعنی "بڑے ستم کی بات ہے کہ تمہاری خواہش تمہیں اس طرف تو کھینچے کہ چلو باہر چل کر سرو و سمن کے حسن سے فیض یاب ہو ــــــ جبکہ اے انسان! تو خود کسی غنچے اور پھول سے کم کھلا ہوا نہیں ہے ــــــ ذرا کبھی دل کا دروازہ کھول کر اپنے باطن میں لہلہاتے ہوئے چمن کی بھی سیر کر!" ــــــ

اب ذرا آیاتِ آفاقی کو علماء طبیعیات و فلکیات وارضیات وکیمیاوغیرہ کے سپرد کرکے "آیت انفسی" پر توجہ مرکوز کریں ـــــ تو پہلی بات یہ سامنے آتی ہے کہ قرآن حکیم میں "نفس" کا لفظ بہت سے مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے ـــــ جیسے :

❶ کلی ذات یا شخصیت کے لئے ـــــ جس کی سب سے نمایاں مثال یہ ہے کہ خود اللہ کی ذات یا ہستی کیلئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے' جیسے ﴿ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفۡسَہٗ ﴾ کے الفاظ میں جو سورۂ آل عمران میں دو مقامات (آیت ۲۸' آیت ۳۰) پر وارد ہوئے ہیں ـــــ یعنی "اللہ تمہیں اپنی (یعنی خود اللہ کی) ذات سے ڈراتا اور خبردار کرتا ہے!"

❷ انسانی وجود کے کسی ایک پہلو یا جزو کے لئے ـــــ جیسے ایک جانب انسانی "جان" کے لئے استعمال ہوا کہ موت کا فرشتہ جان نکالنے آتا ہے تو کہتا ہے: ﴿ اَخۡرِجُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ ﴾ (الانعام : ۹۳) یعنی "نکالو اپنی جانیں!" ـــــ گویا جان یا life کو جو وجودِ انسانی کا جزو ہے اس کا نفس قرار دیا جارہا ہے ـــــ دوسری جانب انسان کی معنوی و باطنی شخصیت کے دو مختلف بلکہ متضاد پہلوؤں کے لئے بھی جو انسان کے رویئے اور طرزِ عمل پر اثر انداز ہوتے ہیں' یہی لفظ "نفس" استعمال ہوا ہے! ـــــ یعنی ایک برائی اور شر کی جانب راغب کرنے والا نفس بفحوائے آیۂ قرآنی : ﴿ وَمَاۤ اُبَرِّیُٔ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ ﴾ (سورۂ یوسف : ۵۳) یعنی "میں اپنے نفس کو بری الذِّمّہ قرار نہیں دیتا (یا دیتی' حسب اختلافِ تفسیر) یقیناً اس کا تو کام ہی یہ ہے کہ برائی کی طرف شدّومد کے ساتھ راغب کرے!" ـــــ اور دوسرے انسانی شخصیت کے اس باطنی عنصر پر جو خیر اور بھلائی کی ترغیب دیتا ہے اور اگر انسان سے کوئی غلط فعل سرزد ہو جائے تو اس پر شدید ملامت کرتا ہے' اور جسے عام اردو محاورے میں "ضمیر" اور انگریزی میں Conscience سے تعبیر کیا جاتا ہے ـــــ چنانچہ قرآن نے اسے "نفسِ لوّامہ" (ملامت کرنے والا نفس) سے موسوم کیا ہے' اور اللہ تعالیٰ نے سورۂ قیامہ کے آغاز پر جہاں یومِ قیامت کی قسم کھائی ہے وہیں اس نفس ملامت گر کی بھی قسم کھائی ہے ـــــ بفحوائے : ﴿ لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾ وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ﴿۲﴾ ﴾

انسان کی باطنی شخصیت کے ان دو متضاد محرکات و داعیات کا تعلق دراصل انسان کے وجود کے ان دو مختلف عناصر سے ہے جن کے باہمی امتزاج و ترکیب سے انسان وجود

میں آتا ہے۔ یعنی ایک وہ حیوانی وجود جو خاکی الاصل ہے ـــــ اور اپنے اندر وہ تمام داعیات اور محرکاتِ عمل رکھتا ہے جو ہر حیوان بالخصوص زیادہ ترقی یافتہ حیوانات میں پائے جاتے ہیں' یعنی بقائے ذات کے لئے کھانا' پینا' استراحت وغیرہ ـــــ اور بقائے نوع کے لئے شہوت و جنسی جذبہ!! ان پر مستزاد ہیں حُبِّ تفوّق (urge to dominate) اور تمدنی رجحان یعنی herd instinct وغیرہ ـــــ اور دوسرا وہ روحانی وجود جس کا تعلق عالمِ بالا سے ہے' جس کا واحد جذبۂ محرکہ (urge) کسی اعلیٰ نصب العین' ارفع آئیڈیل اور بلند آدرش کو اختیار کر کے اس کے حصول کے لئے تن من دھن قربان کر دینا ہے! انسان کا یہ روحانی وجود اپنی ماہیت میں ملائکہ کا ہم پلہ اور مقام و مرتبہ میں ان سے بھی بلند تر ہے ـــــ!

انسان کی شخصیت کے ان دو متمیز و متبائن پہلوؤں کی تعبیر سینکڑوں سال قبل شیخ سعدیؒ نے ان الفاظ میں کی تھی کہ ؎

"آدمی زادہ طرفہ معجون است - از فرشتہ سرشتہ و زحیواں"

یعنی انسانی شخصیت عجب چوں چوں کا مربّہ ہے کہ اس میں ایک جانب مکمل حیوان موجود ہے تو دوسری جانب ایک فرشتہ بھی موجود ہے۔

انسان کے حیوانی وجود کے بارے میں سائنس اور مذہب دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ یہ مٹی اور پانی کے امتزاج سے وجود میں آیا ہے ـــــ اگرچہ اہل مذہب کا غالب رجحان Special Creation کی طرف ہے ـــــ جبکہ سائنس کا رجحانِ غالب Evolution کی جانب ہے' اور خواہ کوئی شخص ڈارون کے نظریئے سے متفق نہ ہو' یہ بہرحال تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس نے تحقیق و تفتیش اور تجسّس و تفحص کا حق بہ تمام و کمال ادا کیا ـــــ اور پانچ سال تک جنوبی امریکہ کے گرد سمندری جہاز میں چکر پورا کر کے نباتات و حیوانات کے لاتعداد نمونے جمع کئے اور پھر ایک نظریہ مرتب کیا ـــــ اور قطع نظر اس کے کہ وہ نظریہ صحت پر مبنی ہے یا مغالطے پر' اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ عمرانیاتِ انسانی میں اس کے ہلاکت خیز اثرات صرف اس لئے رونما ہوئے کہ انسان کو محض حیوان سمجھ لیا گیا ـــــ اور Post-Renaissance دور میں مذہب دشمنی کے

باعث روح اور روحانیت کی جانب سے آنکھیں بالکل بند کر لی گئیں —— ورنہ اگر انسان کے روحانی وجود کو جداگانہ entity کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے ارتقاء کا تعلق صرف اس کے حیوانی وجود کے ساتھ قرار دیا جاتا تو ہرگز کوئی برے نتائج و عواقب پیدا نہ ہوتے۔

انسان کے روحانی وجود کا تعلق براہِ راست ذاتِ باری تعالیٰ سے ہے' بقول شخصے

اتّصالے بے تکیّف بے قیاس - ہست ربّ الناس را با جانِ ناس

یعنی لوگوں کی جان (یہاں مراد نفس روحانی ہے) اللہ تعالیٰ کی ذات سے متصل اور ملحق تو ہے لیکن اس کے اس اتصال اور الحاق کی کیفیت کو کسی مادی مثال پر قیاس نہیں کیا جاسکتا —— بعض مغربی دانشوروں نے بھی انسان کے باطن کے اس "شعلۂ ملکوتی" (Divine Spark) کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور علامہ اقبال نے تو نہایت خوبصورت انداز میں فرمایا ہے کہ ؎

ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں - غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

یعنی ادراک و احساس تو جملہ حیوانات پر مستزاد کیمرے کی فلم کو بھی حاصل ہے' لیکن انسان کے باطن میں تو احساس اور ادراک پر مستزاد ایک ایسی حقیقت بھی موجود ہے جو خود اپنا ظہور چاہتی ہے اور بھڑک کر روشن ہونا چاہتی ہے۔

ہمارے حیوانی وجود کا منبع یہ زمین ہے' چنانچہ یہیں سے اس کی تقویت اور غذا کا سارا سامان بھی آ رہا ہے۔ گندم کہاں سے آ رہی ہے؟ چاول کہاں سے آ رہا ہے؟ یا آپ نے اگر بکرے کا گوشت کھایا ہے تو بکرے کا گوشت اس سبزے یا گھاس سے بنا ہے جو اس نے کھایا ہے۔ source تو وہی ہے۔ وہی ہمارے حیوانی وجود کا source ہے اور وہی اس کو تغذیہ و تقویت کا سارا سامان فراہم کرتا ہے۔ اور ہمارا یہ وجود ہمیں نیچے کی طرف گھسیٹتا ہے' حیوانیت کی طرف' زمینی خواہشات کی طرف' یہ Id اور Libido ہے' جس کے متعلق قرآن کی آیت میں نے آپ کو سنائی ﴿ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْۗءِ...... ﴾ یہ Id اور Libido کا پہلو انسان کو برائی کی طرف لے جاتا ہے کیونکہ اس میں جو lusts اور desires ہیں وہ اندھے بہرے ہیں' انہیں جائز ناجائز میں فرق معلوم نہیں ہے' یہ حلال

حرام کی تمیز نہیں کر سکتے۔ بھوک لگی ہے تو اسے کچھ کھانے کو چاہئے' اس سے غرض نہیں ہے کہ جائز ہے یا ناجائز' حلال ہے یا حرام۔ sexual urge جب بیدار ہو جاتی ہے تو اسے بس اپنی تسکین چاہئے۔ اسے اس سے بحث نہیں ہوتی کہ جائز راستہ کون سا ہے اور ناجائز کونسا! لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ پستی کے تقاضے ہیں' اسی لئے قرآن مجید میں ایک بہت بڑی شخصیت ــــ بلعام بن باعورہ ــــ کا حوالہ دیا گیا ہے (قرآن میں اس کا نام نہیں ہے' توریت میں اس کا ذکر ہے) ﴿ وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ ﴾ (الاعراف : ۱۷۶) "وہ شخص تو زمین کی طرف دھنستا چلا گیا۔" یعنی زمینی خواہشات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لیکن ہمارے وجود کا جو دوسرا عنصر ہے' یعنی روحانی' وہ زمینی نہیں ہے' خاکی نہیں ہے' وہ اللہ کی ذات سے آیا ہے۔ وہ "امرِ ربّ" ہے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی ﴿ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ﴾ (بنی اسرائیل : ۸۵) اور دو جگہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے کہہ دیا تھا کہ جب میں اس آدمؑ کی تخلیق مکمل کر لوں اور اس کو نک سک سے درست کر دوں' اور finishing touches دے دوں' اور پھر اس میں اپنی روح میں سے پھونکوں تو گر پڑنا اس کے سامنے سجدے میں ﴿ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴾ (الحجر:۲۹) یہ ہے وہ روحِ ربّانی جو میرے اور آپ کے اندر موجود ہے We are the custodians of the Divine Spirit ۔ اور دراصل ہماری یہ وہی Divine Spirit ہے جو ہمیں بلندی اور اعلیٰ مقامات کی طرف کھینچتی ہے ــــ اور اگر ہم زمینی خواہشات و شہوات یعنی من جملہ پستی کی طرف مائل ہو جائیں تو ہمیں شد و مد سے ملامت کرتی ہے کہ ؏ "اپنی خودی پہچان! او غافل انسان!"

جدید نفسیات کے باوا آدم سگمنڈ فرائڈ نے انسان کے محرکاتِ عمل اور داعیاتِ نفس میں شہوت (sex) کو بہت زیادہ out of proportion اہمیت دے کر جو فکری سنڈاس ترتیب دیا ہے اس سے شدّت کے ساتھ اعلانِ براءت کرنے کے ساتھ ساتھ میں اس کے انسان کی باطنی شخصیت کے مشاہدے اور اس کے تین لیول identity کرنے کو غیر معمولی دقّتِ نظر (acuteness of observation) پر مبنی قرار دیتا ہوں ــــ یعنی سب سے نیچے Id یا Libido جو عبارت ہے انسان کے حیوانی جبلتوں اور

محرکاتِ عمل سے' اس سے اوپر Ego جو عبارت ہے خودی یا "انا" سے ـــــ اور سب سے بالاتر Super Ego جسے وہ تعبیر کرتا ہے معاشرتی تصورات واقدار سے ـــــ!

میرے مطالعہ قرآن کا حاصل یہ ہے کہ جسے فرائڈ نے Id یا Libido سے تعبیر کیا ہے وہ ہے قرآنی اصطلاح میں "نفسِ امّارہ" ـــــ اور جسے فرائیڈ Super Ego سے تعبیر کرتا ہے وہ ہے "نفسِ لوّامہ" یا بالفاظِ دیگر روحِ ملکوتی ـــــ یا "فاش تر گویم" کے مصداق "روحِ ربانی"!

رہا وہ درمیانی لیول جسے فرائڈ Ego سے تعبیر کرتا ہے اور جسے عرف عام میں "انا" یا "خودی" سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ قرآنی اصطلاح میں "قلب" ہے۔ اور قلب کو قلب کہتے ہی اس لئے ہیں کہ اس کی کیفیت بدلتی رہتی ہے۔ یہ ہمارے پورے جسمانی نظام کا ایک ایسا عضو ہے جسے ایک پل' ایک لحظہ بھی rest نہیں ملتا۔ آپ کا دماغ بھی آرام کرتا ہے' آپ کے سارے tissues ریسٹ کرتے ہیں' لیکن دل کے آرام کا دوسرا نام موت ہے۔ وہ ہردم چل رہا ہے اور کبھی پھیل رہا ہے کبھی سکڑ رہا ہے۔ قلب کے لفظی معنی اسی بدلنے کے ہیں۔ قلبِ ماہیت اسے کہتے ہیں کہ کسی معاملے میں کوئی بنیادی تبدیلی یعنی essential change آگئی۔ انقلاب کا لفظ بھی اسی سے بنا ہے۔ کسی ملک کا اجتماعی نظام یعنی Politico-Socio-Economic سسٹم بدل جائے تو وہ انقلاب ہے۔ چنانچہ اگر قلب نفس کی طرف کھنچ گیا اور نفس کا غلام بن گیا تو اب انسان کی کیفیت نفسِ امّارہ کی ہے۔ بدی' پستی' گندگی' خباثت' اسی کے اندر وہ رہے گا۔ جیسے مکھی گندگی ہی پر بیٹھتی ہے' یہ بھی گندگی پر بیٹھے گا اور اگر مستقل طور پر اس کا رخ روح کی طرف ہو گیا تو اس کو قرآن کہتا ہے : نفس مطمئنہ۔ اب جو Id اور Libido ہے' وہ صرف sub-serve کرے گا' وہ زندگی کے بنیادی تقاضے پورے کرے گا' وہ کنٹرول ہو گا روح کے ذریعے۔ روح قلب کے ذریعے سے اسے کنٹرول کرے گی' اور جب یہ کیفیت ہو گی تو قرآن اسے نفس مطمئنہ کہتا ہے۔ وہ نفس مطمئن ہو گیا' اس لئے کہ روح کی وساطت سے اللہ کا قرب حاصل ہونے کے بعد اور اللہ کے ساتھ ایک باطنی ربط و تعلق قائم ہو جانے کے بعد جو اطمینان اور جو سکون حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ صرف اولیاء اللہ ہی کو ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ داخلی اطمینان و سکون یعنی inner tranquility تو

حاصل ہوتی ہی صرف ایمان کے ذریعے ہے۔ بہرحال اس جگہ پر اگر انسان پہنچا ہو تو وہ بحیثیت مجموعی نفس مطمئنہ قرار پاتا ہے۔ اور کس قدر پیارے الفاظ وارد ہوئے ہیں قرآن میں کہ نفس مطمئنہ کا جب انتقال ہوتا ہے تو اس وقت اللہ کی طرف سے پیغام آتا ہے :

﴿ يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ اِرْجِعِىْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○
فَادْخُلِىْ فِىْ عِبٰدِىْ ○ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ ○ ﴾ (الفجر : ۲۷۔ ۳۰)

یعنی "اے نفس مطمئنہ! لوٹ جا اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ وہ تجھ سے راضی اور تو اس سے راضی۔ اب میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا!"

یہ دو انتہائی پوزیشنیں میں نے آپ کو بتائی ہیں۔ اگر قلب کا رخ مستقل Id اور Libido کی طرف ہے تو یہ پستی کا مکین انسان ہے' انسان غلط راستے پر جا رہا ہے۔ اگر مستقل طور پر قلب کا رخ روح کی جانب ہے تو یہ نفس مطمئنہ ہے ـــــ اور اگر معاملہ میرے اور آپ کا سا ہے' یعنی کچھ اِدھر کچھ اُدھر' فیصلہ کن طور پر نہ اِدھر نہ اُدھر' کبھی نفس کی طرف رُخ ہو گیا تو کوئی گری ہوئی حرکت کر بیٹھے' کبھی روح کی جانب رخ ہو گیا تو اچھا کام کر لیا' لیکن یہ کہ جب برا کام بھی کرتا ہے تو روح ملامت کرتی ہے اور from within your own self کوئی شے اسی طرح کی ملامت کرتی ہے کہ جیسے فیض نے نقشہ کھینچا ہے کہ ؏ :

"چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت"

باہر سے کوئی دشنام ابھی آیا کہ نہیں آیا اور کسی ملامت گر کی طرف سے کوئی ملامت ہوئی یا نہیں ہوئی' خود آپ کے اندر سے آپ کی روح ملامت کر رہی ہے کہ تجھے اللہ نے کہیں اور کے لئے بنایا تھا' تو کدھر چلا گیا' تیرا مقام تو کچھ اور تھا! یہ تو کس گراوٹ میں مبتلا ہو گیا؟

اب میں اس سلسلے میں آپ سے ایک بہت اہم بات کر رہا ہوں علامہ اقبال کے حوالے سے۔ آپ کو معلوم ہے ان کا فلسفۂ خودی مشہور ہے' اگرچہ شارحین کی مختلف شرحوں کی وجہ سے وہ چیستان بن گیا ہے۔ عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ خودی سے اصلاً مراد کیا ہے' لیکن یہ بہت پیارا واقعہ ہے جو سید نذیر نیازی مرحوم نے خود سنایا تھا۔ ہمارے ہاں ایک قرآن کانفرنس میں بیان کیا تھا اسی لئے ہم نے اسے چھاپ بھی دیا تھا۔ کہ

میں نے سوال کیا حضرت علامہ سے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کا فلسفۂ خودی نطشے سے ماخوذ ہے‘ کچھ لوگ کسی اور فلسفی کا نام لیتے ہیں‘ آپ خود بتائیے کہ آپ کے فلسفہ خودی کا source کیا ہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا کل آجانا‘ میں تمہیں dictate کرادوں گا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ساری رات اس خوشی سے سویا نہیں کہ یہ مفکرِ اسلام اور یہ عظیم فلسفی شاعر مجھے یہ مقام عطا فرما رہا ہے کہ وہ مجھے اپنے فلسفۂ خودی کے source کے حوالے سے dictate کرائیں گے!! چنانچہ وہ وقت مقررہ پر گئے‘ پنسل کاغذ تیار‘ گویا کیل کانٹے سے لیس‘ لیکن حضرت علامہ نے فرمایا : ”اچھا ذرا وہ قرآن مجید نکالنا۔ انہوں نے خود کہا کہ میرے تمام ذوق و شوق پر اوس پڑ گئی‘ میں سمجھا تھا کہ کوئی فلسفے کی کتاب نکلوائیں گے‘ لیکن یہ تو قرآن مجید کی بات کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا سورۃ الحشر نکالو‘ تیسرے رکوع کی دوسری آیت دیکھو : ﴿ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ... ﴾ (الحشر : ۱۹) یعنی ”دیکھنا ایسے لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا“۔ گویا اللہ کو بھلانے کی سزا نقد اس دنیا میں اپنے آپ سے غافل ہو جانا ہے۔ یہ ”اپنا آپ“ کون سا ہے؟ کیا انسان اپنے پیٹ سے غافل ہوتا ہے؟ کیا اپنی شہوت سے غافل ہوتا ہے؟ کیا اپنی ضروریات سے غافل ہوتا ہے؟ ذرا سی پھنسی کہیں نکل آئے تو دوڑ کر نہیں جاتا ڈاکٹر کے پاس؟ کس سے غافل ہوتا ہے؟ معلوم ہوا کہ آپ کے وجود کا یہ جو ظاہری پہلو ہے‘ اس کے علاوہ کوئی اور نفس ہے آپ کا‘ اس کے علاوہ کوئی اور حقیقت ہے آپ کی۔ اس کے لئے میں سادہ الفاظ میں سمجھایا کرتا ہوں کہ دیکھئے یہ جو ”مَیں“ ایک ضمیر ہے اور ”میرا“ اس کا possessive mood ہے‘ اس کا لازمی تقاضا ہے کہ ”مَیں“ میرے وجود سے ایک جداگانہ شے ہے۔ اس لئے کہ جب میں کہتا ہوں ”میری عینک“ تو عینک اور ہے اور مَیں اور ہوں۔ اسی طرح ”میرا قلم“ میں مَیں اور ہوں قلم اور ہے۔ جب کہا جائے کہ میرا جسم تو یہ ”مَیں“ کون ہے؟ میرے ہاتھ‘ میرے پاؤں‘ میرا سر‘ میرا پیٹ‘ میرے اعضاء‘ میرے جوارح‘ سب میرے ہیں۔ لیکن میں کون ہوں؟ وہ ہے انا‘ وہ ہے خودی۔ وہ اس جسم سے عبارت نہیں ہے۔ وہ بہت ارفع شے ہے‘ ماورائی شے ہے۔ وہ روح ہے۔ اب دیکھئے اس آیت کو کہ ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا کہ جنہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ وہ

دراصل اپنی روح سے غافل ہو گئے۔ سب سے بڑا ظلم ڈارون نے یہی کیا کہ ہمیں یہ باور کرا دیا کہ ہم بھی بس ایک حیوان ہیں۔ slightly more evolved! جتنا فرق ہے گدھے میں اور گھوڑے میں کہ گھوڑا refined animal ہے' جبکہ گدھا بیچارہ ذرا coarse حیوان ہے' باقی کیا فرق ہے دونوں میں؟ اسی طرح چمپانزی یا گوریلا میں اور انسان میں کیا فرق ہے؟ وہ ذرا coarse ہے' ہم ذرا refined ہیں اور بس! گویا ہم مستغنی ہو چکے ہیں اپنی عظمت سے' اپنی انا سے' اپنی حقیقت سے' اپنے اصل وجود سے' اب انسان اپنے آپ کو صرف حیوان کہتا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے اسی لئے بڑے مزاحیہ انداز میں کہا تھا ؎

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولا بوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

گویا منصور کی ہمت اور اولوالعزمی یہ تھی کہ اس نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا اور ڈارون کی پست ہمتی اور دناءتِ طبع کا عالم یہ ہے کہ اپنے آپ کو بندر قرار دے رہا ہے۔ لیکن میں عرض کر چکا ہوں کہ ڈارون کو بھی میں بہت عظیم سائنس دان سمجھتا ہوں۔ یہ نہ سمجھئے کہ وہ کوئی عام آدمی تھا' لیکن مکمل صحیح فلسفہ صرف قرآن سے مل سکتا ہے' اور کہیں سے نہیں ملے گا' ورنہ آدمی ٹھوکریں کھائے گا' یا مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف' یا ایک افراط کی طرف یا دوسری تفریط کی طرف۔

اب دیکھئے یہ حقیقت چونکہ Universal Truth کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا میں قرآن مجید کی سورۂ حشر کی اس آیت کا مفہوم اپنشد کے حوالہ سے آپ کو سناتا ہوں۔ اپنشد کا ایک اشلوک ہے۔ ذرا اس کا ترجمہ انگریزی میں ملاحظہ کیجئے :

"man in his "ignorance" identifies himself with the material sheaths which encompass his real self"

گویا "real self" کچھ اور ہے' اس کے گرد مادی غلاف ہیں۔ جیسے کپڑوں کے تھان آپ دیکھتے ہیں' اندر کوئی گتہ ہے یا کوئی اور لکڑی ہے جس کے اوپر کپڑا لپٹا ہوا ہوتا ہے'

اسی طرح وہ ہمارا اندرونی وجود کچھ اور ہے جس کے اوپر یہ گوشت اور ہڈیاں ہیں اور ہماری کھال اور چربی کا غلاف اوڑھا دیا گیا ہے' اور یہ جہالت اور جاہلیت ہے کہ انسان اسی کو سمجھتا ہے کہ میں یہ ہوں۔ "man in his ignorance"۔ ایک زمانہ آپ کو یاد ہوگا وہ تھا جب امریکہ کی جان پر بنی ہوئی تھی' اس لئے کہ ادھر خلا کی تسخیر میں USSR بہت آگے نکل چکا تھا' اور اُدھر کمیونزم کا سیلاب آ رہا تھا اور امریکہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ ہم سے کہتا تھا تم اپنا قرآن پڑھو بھائی' داس کیپیٹال (Das Capital) نہ پڑھو۔ قرآن پڑھو' وہ ہم تمہیں دیتے ہیں' چنانچہ امریکی حکومت نے "The Glorious Quran" لاکھوں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا۔ اسی طرح گیتا اور اپنشد کے انتخاب پر مشتمل لاکھوں کاپیاں مفت تقسیم کیں۔ ہندوؤں سے کہا یہ پڑھو' گیتا پڑھو' اپنشد پڑھو' خواہ مخواہ کمیونسٹ لٹریچر کیوں پڑھتے ہو! اس زمانے میں مجھے اپنشد کا ایک ترجمہ مل گیا تھا' امریکہ کا تقسیم کردہ! میں نے دیکھا کہ اس میں بھی highest level پر وہی بات ہوئی ہے' اور بلند ترین سطح پر جو کچھ قرآن کہہ رہا ہے وہی اپنشد کہہ رہا ہے' بنیادی طور پر تو کوئی فرق نہیں ـــــ بہرحال اس حوالہ سے یہ تین levels ہیں۔ نفس امارہ (Id' Libido) یہ سب سے نچلی سطح ہے' دوسری انتہاء پر بلند ترین مقام پر Supper Ego کو رکھئے۔ یہ روح ہے ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ﴾ کی رو سے Divine Matter اور Divine Affair ہے۔ اور درمیان میں قلب ہے' جو کبھی اِدھر کبھی اُدھر' کبھی ادھر کی دھڑکن ہے' کبھی ادھر کی دھڑکن ہے۔ اگر روح کی جانب یکسو ہو جائے تو وہ نفس مطمئنہ ہے۔

لیکن میں اب آخری بات پر اپنی گفتگو ختم کر رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جیسے ہمارے اس lower being کے تقاضے ہیں۔ کھانا' پینا اور sexual urge اور بھی جتنے urges ہیں خواہ وہ Edler نے گنوائے ہیں یا کسی اور نے' وہ سب کے سب ٹھیک ہیں۔ اسے "حیوانیات" کہئے یا "نفسیاتِ حیوانیہ" جبکہ "نفسیاتِ روحانیہ" بجائے خود ایک جداگانہ علم ہے۔ روح کی urge کیا ہے؟ روح کی urge صرف ایک ہے اور وہ ہے "طلب حسن" لیکن اس حسن کے بہت سے لیول ہیں۔ بلند ترین حسن اور کامل ترین خوبی ذاتِ باری تعالیٰ ہے' حسن کامل' حسن ازل جس کا ایک پرتو خود ہمارے وجود میں روح

کی صورت میں موجود ہے۔ چنانچہ روح اللہ سے لو لگانا چاہتی ہے۔ ہر شے اپنے مرکز کی طرف لوٹتی ہے ؎

"اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن!"

کے مصداق وہ اپنے مرکز کی طرف جانا چاہتی ہے۔ زمین کی شے زمین کی طرف جانا چاہتی ہے ﴿ وَلٰکِنَّہٗٓ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ ﴾ جبکہ روح اللہ کی طرف جانا چاہتی ہے' یہ urge روح کی اصل urge ہے۔ لیکن بدقسمتی سے جو لوگ اللہ کو نہیں پہچان پاتے ﴿ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ﴾ (الحج : ۷۴) وہ کسی کم تر شے کو خدا بنا کر پوجنا شروع کر دیتے ہیں' جیسے کوئی ideal' کوئی تصور' بقول شاعر ؎

اک تصور کے حسنِ معنیٰ پر
ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد
کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے

کوئی goal' کوئی Ideal' کوئی آدرش! غور طلب بات ہے کہ سب سے بڑا حیوانی داعیہ (animal instinct) تو preservation of the self ہے۔ گویا اپنی جان کو بچانا سب سے بڑا instinct ہو گا' لیکن کسی نظریے کی خوبصورتی آپ کو آمادہ کرتی ہے کہ آپ اپنے آپ کو اس پر قربان کر دیں۔ لاکھوں کیمونسٹوں نے اپنی جانوں کو قربان کیا یا نہیں کیا؟ فائرنگ سکواڈ کے سامنے آکر جانیں دیں کہ نہیں دیں؟ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ انسان کے اندر تحفظ ذات سے بھی بڑھ کر بلند تر اور قوی تر urge موجود ہے —— یہ جذبہ اور یہ امنگ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے ہے —— بقول علامہ اقبال "منزل ما کبریاست"۔ یعنی ہماری منزل خدا ہے' ہمارا آئیڈیل خدا ہے' خدا پرستی ہی ہمارا دین ہے —— لیکن جب انسان خدا تک نہیں پہنچ پاتا تو کسی اور شے کو اس کی جگہ substitute کر دیتا ہے۔ چنانچہ خدا پرستی کی جگہ وطن پرستی' قوم پرستی' زر پرستی' شہوت پرستی' الغرض کسی نہ کسی کی پرستش لے لیتی ہے۔ یہ پرستش انسان کی فطرت میں ہے۔ وہ کسی کو پوجنا چاہتا ہے' کسی کے سامنے سر جھکانا' کسی سے دعا

کرنا چاہتا ہے' کسی کو اپنا سہارا ماننا چاہتا ہے' کسی پر توکّل کرنا چاہتا ہے' کسی کے لئے بھوکا رہنا چاہتا ہے' کسی کے لئے مرجانا چاہتا ہے' اگر کسی انسان میں یہ urge نہیں ہے تو وہ حیوان ہے۔ ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ (الاعراف : ۱۷۹) وہ خود زندگی نہیں گزارتے بلکہ زندگی انہیں گزارتی ہے' جب تک زندگی میں آپ کا کوئی آئیڈیل' کوئی آدرش' کوئی نصب العین نہیں ہے تو آپ حیوانی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں۔ بلند ترین آدرش اور سب سے اونچا نصب العین ذاتِ باری تعالیٰ ہے ــــــ لیکن اگر کوئی شخص اللہ کے جمال و جلال کا اندازہ نہ کر سکے جیسا کہ اللہ کا اندازہ کرنا چاہئے تو وہ کسی ادنیٰ شے یا تصور کو اس کا قائم مقام تصور کر کے اسے پوجنا شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ اگر انسان اللہ کے جلال اور اس کے جمال کی کوئی جھلک دیکھ لے تو پھر وہ کسی اور شے یا کسی اور ہستی کی طرف مائل ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے روح کی urge اور اسی کے حوالے سے ہے علامہ اقبال کا فلسفہ خودی اور اس کی شرح' جو ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے کی ہے۔ میں مشورہ دوں گا جو طلبہ اور طالبات یہاں موجود ہیں وہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی "Ideology of the Future" نامی کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے سامنے نفسیات کا' سائیکالوجی کا ایک بالکل نیا پہلو آ جائے۔ میں بہت ممنون ہوں منتظمین کا کہ انہوں نے یہ موقع مجھے دیا کہ آپ سے مخاطب ہو سکوں اور آپ سب کا بھی کہ آپ نے بڑے صبر اور سکون کے ساتھ میری باتیں سنی ہیں۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات OO

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے بعض ذاتی اور مالی و معاشی کوائف پر مشتمل

حسابِ کم و بیش

کا نیا ایڈیشن جسے update کرنے کی خاطر امیر تنظیم کی چار صفحات پر مشتمل ایک تازہ تحریر "پس نوشت" اور نائب امیر کا تحریر کردہ مختصر "ضمیمہ" کا اضافہ کر دیا گیا ہے'

شائع کردہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور